R. No. 2186/57

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

جلد ۲۴ - شمارہ ۲۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ جولائی ۱۹۶۵ء

اداریہ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی چھٹی رپورٹ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی چھٹی رپورٹ شایع ہوگئی ہے اس میں ۱۹۶۳ء کی کارگزاری درج ہے۔ اس رپورٹ پر مفصل تبصرہ ہماری زبان میں علیحدہ ہوگا لیکن پہلی نظر میں جو اہم نکات نظر آئے ان پر اظہار رائے یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

کمشنر نے اپنا کام خاصی ایمانداری سے کیا ہے۔ اس کے پاس جو بھی شکایت پہنچی ہے، اس کی وہ تحقیقات کرتا رہا ہے، ریاستی حکومتوں کو توجہ دلاتا ہے۔ اس کے علاوہ خود بھی دورہ کرکے خاص خاص مقامات پر جاتا ہے اور وہاں کے لوگوں کی شکایات سنتا ہے۔ لیکن اس رپورٹ کو پڑھ کر پھر یہ احساس تازہ ہوتا ہے کہ ریاستی حکومتیں نہ اس کی خط وکتابت پر پوری توجہ کرتی ہیں اور نہ اس کی سفارشات پر۔ ہاں پارلیمنٹ میں جب رپورٹ پیش ہوتی ہے تو کچھ ممبر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ ہماری رائے میں اب صرف یہ صورت رہ گئی ہے کہ صدر اس رپورٹ کی روشنی میں مناسب ہدایات جاری کریں۔

سب سے عجیب بات یہ ہے کہ پنجاب کی حکومت کے نزدیک دفعہ ۳۵۰ الف کی پابندی لازمی نہیں ہے، یہ صرف ایک ہدایت ہے۔ کمشنر نے بجا طور پر اس معاملے میں تشویش کا اظہار کیا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ صدر کی ہدایت اس سلسلے میں ضروری معلوم ہوتی ہے۔

کمشنر نے یہ بھی کہا ہے کہ ثانوی منزل پر لسانی اقلیتوں کی مادری زبان میں تعلیم کے متعلق حکومت ہند نے کوئی واضح پالیسی ابھی تک نہیں بنائی اور اس سلسلے میں بھی ریاستی حکومتوں کو ہدایات دینی ضروری ہیں۔

سب سے اہم کمشنر کی یہ رائے ہے کہ سہ لسانی فارمولے میں اقلیتوں کی مادری زبان کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق ہے۔ انجمن شروع ہی سے اس کی طرف توجہ دلاتی رہی ہے۔ کمشنر نے کئی سال ہوئے ہر اسکول میں ایڈمیشن رجسٹر رکھنے پر زور دیا تھا تاکہ معلوم ہوجائے کہ کتنے طلبا اقلیت کی زبان میں تعلیم چاہتے ہیں۔ اس سفارش پر بھی بڑی بے دلی سے عمل ہوا ہے۔

چیف سکریٹریوں کی کانفرنس نے یہ طے کردیا تھا کہ اقلیتوں کے لیے اب تک جو سہولتیں رہی ہیں وہ کسی طرح کم نہ ہونے پائیں۔ کمشنر نے اس سلسلے میں بھی ریاستی حکومتوں کو توجہ دلائی تھی مگر وہی صدائے برنخواست۔

سرکاری اغراض ومقاصد کے لیے اقلیتوں کی زبان کے مناسب استعمال کی بھی کمشنر کو کوئی شہادت نہ ملی۔ نہ حکومت اور قومی تعمیر کے کاموں کے سلسلے میں پبلسٹی کی۔ ریاستی حکومتوں نے اتنا بھی نہ کیا کہ ان سہولتوں کے متعلق جو لسانی اقلیتوں کو دی جاتی ہیں ایک پمفلٹ ہی شایع کردیتیں۔

اترپردیش کی حکومت کا ریکارڈ دیکھی ہے۔ اس کی بے ڈھنگی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آبادی کے تناسب کو

اس شمارے میں

دیکھتے ہوئے بہار میں ابتدائی منزل پر اردو کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد گھٹی ہے۔ ثانوی منزل پر اتر پردیش میں ذریعہ تعلیم کا تو سوال ہی نہیں، ہاں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے بھی اردو بہت کم اسکولوں میں ہے۔ سہ لسانی فارمولے میں مادری زبان کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، سرکاری کاغذات اقلیت کی زبان میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں ہندی لازمی ہے۔ غرض کمشنر کے بار بار توجہ دلانے کے باوجود اتر پردیش کی حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اردو دوستوں نے اب تک جو شکایات کی ہیں ان میں سے بیشتر کی اس رپورٹ سے تصدیق ہو جاتی ہے۔ خال خال کمشنر کے کہنے سے ریاستی حکومتوں نے کچھ انتظامات کیے ہیں، مگر یہ انتظامات بھی ہندی کی ریاستوں میں بہت کم ہوئے ہیں۔ اب تو صدر کے اپنے نمائندے کی سفارشات کی روشنی میں مناسب قدم اٹھانا ضروری ہو گیا ہے۔ اول تو خاص خاص ریاستوں میں جہاں ان کی مناسب تعداد ہو لسانی اقلیتوں کی زبان کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے، دوسرے کل ہند لسانی پالیسی کو پھر سے واضح کیا جائے اور ریاستی حکومتوں کو ہر مد کے سلسلے میں تفصیل کے ساتھ ہدایات دی جائیں۔ مادری زبان کو جب تک سارے نظام تعلیم میں مناسب اہمیت نہیں دی جاتی اس وقت تک لسانی اقلیتوں کی ترقی اور خوش حالی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

سیر بین

ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند نے چند دن ہوئے لالہ لاجپت رائے سینٹنری قومی یک جہتی کیمپ کا افتتاح کرتے ہوئے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ کیمپ کے آٹھ دنوں میں تیس سے قریب تقریریں ہوں گی۔ انھوں نے نوجوانوں سے کہا کہ وہ جب واپس جائیں تو تقریر بازی کی عادت چھوڑ دیں کیونکہ تقریروں سے ہمیشہ بحث میں قرار واقعی مدد نہیں ملتی۔ لطف یہ ہے کہ کیمپ کا افتتاح ذاکر صاحب کی تقریر سے ہوا اور اس کا اختتام لال بہادر شاستری جی کی تقریر پر ہوگا۔ بہت پہلے اکبر کہہ گئے ہیں ؎

ترقی کی نہیں ہم پر جسٹر جائیں
گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھائیں

گپ، تقریر، کانفرنس ہماری پوری زندگی اس تثلیث کے گرد گھومتی ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم نے جب کامریڈ میں اس کالم کا آغاز کیا تو انھوں نے اس قومی خصوصیت کی نشاندہی کی تھی۔ ہم لوگ نہ صرف فرصت کے اوقات گپ میں گزارتے ہیں بلکہ کام کے اوقات میں سے بھی خاصا وقت گپ میں صرف کرتے ہیں۔ اور یہ گپ ہوتی کیا ہے! تازہ ترین خبریں یا افواہیں، جو آدمی ناپسند ہے اس کا نیا جرم، جو محبوب ہے اس کی نئی صفت، قوم کی ناقدری کا ماتم (ماتم کرنے والا اس بھیڑ سے علیحدہ ہے) زمانے کی کج روی کا شکوہ، گویا زمانے کا خاص مقصد صرف کچھ لوگوں کی تلخی میں اضافہ کرنا ہے۔ اور اس گپ کے ساتھ چائے کا دور بھی چلتا رہتا ہے۔

پوری قوم دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ایک تقریر کرنے والوں کی نسبتاً چھوٹی جماعت ہے، دوسری سننے والوں کی بڑی جماعت ہے۔ پہلی جماعت میں سے دوسری جماعت میں کوئی نہیں جاتا۔ یہ ارتداد ممکن نہیں۔ تقریر کرنے والا تقریر سن نہیں سکتا، ہاں صرف اس وقت تک سن سکتا ہے جب تک اس کی باری نہ آئے۔ دوسری جماعت میں سے کچھ لوگ بالآخر پہلی برادری میں در آتے ہیں۔ کچھ بڑے لوگوں سے ان کا پروگرام پوچھیے تو یہ مد نہیں ملے گی کہ فلاں تعمیری کام کرتا ہے یا فلاں مضمون لکھنا ہے، ہاں یہ مد ضرور ملے گی کہ میرٹھ میں اتنی تقریریں، دہلی میں اتنی اور بلند شہر میں اتنی۔ اور ہمارے وزیروں کی ڈائری دیکھیے تو شاید کوئی دن خالی جاتا ہو جب وہ کسی کانفرنس کا افتتاح یا کسی سمینار کی صدارت نہ کر رہے ہوں۔

گپ اور تقریر کا لازمی نتیجہ کانفرنس بازی ہے۔ زور شور سے کانفرنس کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ دو بڑے آدمی چنے جاتے ہیں، ایک افتتاح کے لیے، ایک صدارت کے لیے۔ استقبالیہ کمیٹی بنتی ہے، چندہ ہوتا ہے، باہر کے مہمان آتے ہیں، کبھی کبھار صدر کا جلوس بھی نکلتا ہے۔ پھر کانفرنس ہوتی ہے۔ دھواں دھار تقریریں، گرم گرم قراردادیں اور آخر میں منھ کا مزا بدلنے کے لیے کوئی مشاعرہ یا کوئی سمیلن یا کلچرل پروگرام۔ اور اس کے بعد دوسری کسی کانفرنس کی بات چیت شروع ہو جاتی ہے۔

دس ہزار روپیہ کا میر ایوارڈ

لکھنؤ۔ یکم جولائی۔ آل انڈیا میر اکیڈیمی کے صدر جناب مقبول احمد لاری نے بتایا کہ اکیڈیمی نے میر ایوارڈ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دس ہزار روپیہ کا یہ انعام ہر سال اردو کی بہترین کتاب پر دیا جائے گا۔

صدر اکیڈیمی نے یہ بھی بتایا کہ اکیڈیمی اچھے اور نئے ادیبوں کو قرضے بھی دے گی تاکہ وہ اپنی کتابیں بھی شایع کر سکیں۔ ان قرضوں پر سود نہیں لیا جائے گا۔ (الجمعیۃ)

ابوذر عثمانی

اکبر اور مسئلۂ زبان

اکبر اردو کے تنہا شاعر ہیں جنھوں نے براہِ راست اپنے عہد کے ابھرتے ہوئے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو سماجی معاملات و مسائل پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی چنانچہ ان کی شاعری میں ان کے عہد کے ہنگاموں اور انقلابات اَن گنت نئے بدلتے ہوئے حالات اور ان کے نتیجے میں معاشرے میں رونما ہونے والی نئی نئی صورتوں کی بے مثل مصوری ملتی ہے۔ اس لحاظ سے اکبر نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ اردو کے تمام شعراء میں سب سے زیادہ واضح، متعین اور موثر کردار کے حامل رہے ہیں۔ یوں تو ہر فنکار ہی گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور جس ماحول اور عہد سے اس کا تعلق ہوتا ہے، اس کی آواز بھی بڑی حد تک اس کے الفاظ اور فقروں میں گونجتی ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود یہ چیز ہر فنکار کے یہاں ایک ہی انداز اور رنگ میں نہیں پائی جاتی بلکہ اس کی نمود مختلف فنکاروں کے یہاں مختلف درجوں اور رنگوں میں ہوتی ہے: واضح اور نمایاں فرقِ مراتب کے ساتھ جس کی ایک وجہ جو بڑی حد تک اصلی اور بنیادی ہے، فنکاروں کا اپنا الگ الگ مذاق، میلان اور مطمحِ نظر ہے لیکن اہم بات یہ بھی ہے کہ ہر فنکار کی قوتِ مشاہدہ، زورِ تخیل اور جمالیاتی احساس یکساں نہیں ہوتی جس فنکار کا مشاہدہ جتنا زیادہ تیز جس کی نگاہ جتنی زیادہ وسیع اور جس کی حس جتنی زیادہ بیدار ہوگی فی الحقیقت وہ واقعات و مناظر سے اسی قدر زیادہ متاثر، ان پر اسی قدر زیادہ حاوی اور ان کی ترجمانی پر اسی قدر زیادہ قادر ہوگا۔ اکبر کے کلام میں جو ان کے عہد کی اس قدر زندہ، بھرپور اور گوناگوں مصوری ملتی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک تیز نگاہ باریک بیں اور کافی حساس شاعر تھے۔ ان کا ذہن انتہائی جزرس اور نکتہ رس تھا اور وہ بظاہر غیر اہم اور معمولی واقعات کو بھی ان کی پوری جزئیات، نتائج اور عواقب و اثرات کے ساتھ عریاں اور بے پردہ دیکھ لیتے تھے، در اصل یہی وہ منفرد کمال تھا جس نے اکبر کو ان کے ہم عصر شعراء میں نہ صرف ممتاز اور سربلند بنایا بلکہ انھیں "لسان العصر" کا خطابِ زریں بھی عطا کیا۔ اکبر کی شاعری صحیح معنوں میں ایک مخصوص دور کے انقلابات و حوادث کی سچی روداد ہے، یہ ایک آئینہ ہے جس میں ایک ہنگامہ خیز دور اس عہد اور اس کے جلو میں پرورش پانے والے رجحانات اور کشمکشیں اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ منعکس ہیں۔ اکبر اپنی اسی خوبی اور کمال، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں کہنا چاہیے، انفرادیت کی وجہ سے اردو شاعری میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے میں یہاں ان کی شاعری کے سماجی پس منظر سے بحث کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کی شاعری کے ایک ایسے پہلو اور رخ سے نقاب اٹھانا چاہتا ہوں جو ان کے موضوعِ شاعری سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا اہم بھی ہے خاص طور پر جب ہم اس کا مطالعہ ان کے میلانِ ذہنی، ان کے عہد کی اہم تحریکات، ان کی شاعری کے بنیادی محرکات اور اس کی سماجی فضا کے وسیع پس منظر میں کرتے ہیں تو اس کی اہمیت اور معنویت کا اور بھی شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے، اس سے ان کے ذہن اور شخصیت کے بعض مخفی گوشے نمایاں ہوتے ہیں اور ان کے دور کی کچھ مخصوص پیچیدگیوں اور نزاکتوں کا انکشاف ہوتا ہے، میری مراد زبان و ادب کے مسائل اور قدروں سے ہے جن کے متعلق اکبر نے جابجا اپنے اشعار میں عجیب اشارے کیے ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے اپنے عہد کے لسانی جھگڑے، اس کی نوعیت و حقیقت، اس کے محرکات و مہیجات، اس کے نتائج و اثرات اور اس کے حل کی صورتوں پر بھی اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں ایسے ایسے موثر اور معرکہ آرا نکتے نکالے ہیں کہ ان کی ذہانت و جودت، ان کی نکتہ آفرینی اور ان کی تیز اور فطری اپج کی داد دینی پڑتی ہے۔

اکبر زبان و ادب کے معاملات پر سطحی غور و فکر کے قائل نہ تھے انھوں نے ان معاملات کی صحیح اہمیت کو سمجھا ہے اور ان پر بڑی گہری اور حقیقت پسندانہ رائیں دی ہیں وہ الفاظ و معانی کے صحیح ربط و تعلق سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ محض الفاظ جب تک ان میں کچھ معنی نہ پیدا کیے جائیں، بیکار ہیں، وہ معانی کو الفاظ پر فائق سمجھتے ہیں اور جو لوگ صرف الفاظ کی دکان لگاتے ہیں ان سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

معنی کی گرہ کہاں کھلی ہے   الفاظ ہی کی دکان لگی ہے

وہ شاعری کو زبان سے نہیں بلکہ دل سے عبارت سمجھتے ہیں۔

دل چھوڑ کر زبان کے پہلو میں آ پڑے
ہم لوگ شاعری سے بہت دور جا پڑے

وہ شاعری کو صحیح معنوں میں جذبات کی زبان سمجھتے تھے الفاظ و محاورات، صنائع بدائع اور دوسرے خارجی تکلفات و لوازمات کی، ان کی نظر میں بہت زیادہ اہمیت نہ تھی شاعری میں جب تک جذبے کی حرارت اور تپش نہ ہو، اس وقت تک وہ شاعری نہیں ہے کچھ اور ہے، ان کا ایک بڑا پر لطف شعر ہے ؎

صورتِ لیلیٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوانِ قیس
شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

اکبر شاعر کے لیے جذبات کی تہذیب و تربیت اور تزکیہ و تطہیر کو ضروری سمجھتے ہیں، شاعر کے جذبات جب اس کے دل کی بھٹی میں اچھی طرح تپ لیتے ہیں تو ایک مخصوص جلا، پاکیزگی اور نکھار لیکر نمودار ہوتے ہیں، شاعر کے لیے جذباتی ریاض کی ضرورت بالکل

مسلم ہے، اکبرؔ نے اس کی اہمیت کو ایک مثال کے ذریعہ بڑی خوبی سے واضح کیا ہے ؎

دل ہی باقی نہیں اب ڈٹ سے مضامیں کیسے
آپ موتی کے طلبگار ہیں دریا بھی تو ہو

اکبرؔ زبان و بیان کی بے جا اور نارو ابندشوں کے قائل نہ تھے، وہ زبان میں زیادہ سے زیادہ وسعت اور لوچ پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں، یہاں تک کہ متروکات تک کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں، وہ زبان کا انسانی جذبات و احساسات اور ان کی نمو اور پرورش و ارتقا سے جو گہرا تعلق ہے، اس سے بے خبر نہ تھے، اس لیے وہ زبان کی توسیع پر اس قدر شدید زور دیتے ہیں ؎

وسعت ہو زبان کی ادھر جھک
متروک کو دیکھ کر تو مت رک

اکبرؔ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تنگ نظر اور قدامت پرست تھے، کیونکہ وہ نئی تبدیلیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جو نئے خیالات و افکار لوگوں کے ذہنوں میں تیزی سے راہ پا رہے تھے، ان سے ذہنی مطابقت نہیں پیدا کر سکے، یہ اعتراض ایک بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے، اکبرؔ نئے خیالات کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ مخالف تھے ان کی کورانہ اور مجنونانہ تقلید کے، وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ نئے خیالات کی جانب یہ غیر محتاط اور انتہا پسندانہ میلان آئندہ کیا گل کھلائے گا انھوں نے جن شبہات اور اندیشوں کا اظہار کیا تھا، وہ غلط نہیں نکلے، اپنے دور کے میلانات اور ان کے نتائج کا انھوں نے حالیؔ اور سرسیدؔ کے مقابلے میں زیادہ صحیح اور بہتر اندازہ کیا تھا، اور اس معاملے میں وہ ان دونوں بزرگوں سے یقیناً زیادہ دور بیں اور دور اندیش تھے، انھوں نے قدیم اقدار و روایات سے جس گہری شیفتگی اور شغف کا اظہار کیا ہے، وہ یونہی نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے کچھ مستقل اصول و مقاصد اور بعض مخصوص حالات و محرکات کار فرما تھے، انھوں نے قدامت اور جدیدیت کی اس کشمکش میں اپنا راستہ کافی سوچ سمجھ کر متعین کیا تھا، ایک جگہ انھوں نے اپنا نقطۂ نظر بڑے پُر لطف انداز میں واضح کیا ہے ؎

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کیا خبر نہیں اے ڈالیو تمہیں

اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

اکبرؔ جب کہتے ہیں ؎

ہماری اصطلاحوں سے زبان نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوگی

تو اس سے ان کی تنگ نظری یا غلط اندیشی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی ساحری اور نکتہ رسی کا وہ حالات کی نبض کو پہچانتے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ لغاتِ مغربی کا اثر و نفوذ اگر اسی طرح جاری رہا تو لوگ رفتہ رفتہ اپنی زبان اور اس کی اصطلاحوں سے نا آشنا ہوتے جائیں گے، ان کا یہ اندیشہ غلط بھی نہیں نکلا۔ انھوں نے اسی احساس اور اندیشے کے تحت یہ شعر کہا ہے ؎

سچ کہتے ہیں حضرت کرامت اکبرؔ
رخصت ہوئی فارسی تو اردو بھی گئی

وہ مادری زبان سے بیگانگی کو سخت افسوسناک تصور کرتے ہیں اور اسے کسی قیمت پر برداشت کرنے کو آمادہ نہیں ؎

اے خلافِ انگلش و جرمن ہوں مبارک تجھ کو
ہم کو تو اردو و ہندی میں بسر کرنا ہے

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اکبرؔ انگلش و جرمن کے واقعتاً مخالف تھے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ انھیں کسی غیر ملکی زبان سے کوئی بیر نہ تھا، انھیں جو کچھ اعتراض تھا اس پر کہ ایک غیر ملکی زبان کو مادری زبان کی جگہ اور اس پر ترجیح کیوں دی جا رہی ہے، انھیں ہرگز گوارا نہ تھا کہ کسی غیر ملکی زبان کو مادری زبان کی بقا و ترقی کی راہ میں حائل کر دیا جائے، وہ زبان خصوصاً ملکی و مادری زبان کو ملکی اور قومی اتحاد کا سب سے بڑا وسیلہ تصور کرتے تھے، اسی لیے وہ مادری زبان کے مقابلے میں کسی غیر ملکی زبان کی حوصلہ افزائی درست نہیں سمجھتے تھے، وہ ہندوستانیوں کو، ان کے رشتۂ اتحاد کو مضبوط کرنے ہی کے لیے ملک کی سب سے بڑی اور نمائندہ زبان اردو[2] میں شریک ہونے کا مشورہ دیتے ہیں ؎

اردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں
اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں

اکبرؔ کے زمانہ ہی سے اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہو چکا تھا اور اس کے اثر سے ہندوستانی معاشرے میں طرح طرح کے فتنے اور

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

---

[1] ڈاکٹر احمد سرور بھی جو اکبرؔ کے کچھ زیادہ قائل نہیں ہیں، ان کی اس خصوصیت کا اعتراف کرتے ہیں، ملاحظہ ہو سرور صاحب کا مقالہ "اکبر او سرسید" (نئے اور پرانے چراغ) (ا۔ع)

[2] آج حالات مختلف ہیں اردو کی اس ملک میں اب وہ حیثیت نہیں رہی جو تقسیم ہند سے قبل تھی، اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد بھی آج کافی گھٹا کر دکھائی جا رہی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ یہ زبان اپنے بلند علمی و ادبی معیار اور گرانقدر علمی و ادبی ذخیرے کی وجہ سے آج بھی ہندوستان کی زبانوں میں ممتاز ترین درجہ رکھتی ہے (ا۔ع)

راستہ

آفتاب شمسی

میرے سینے پہ جو ہے خاک آلود
کتنی صدیوں سے رواں ہیں یوں ہی
عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے
فکر و احساس میں غلطاں پیچاں
کوئی بیتے ہوئے لمحوں پہ ملول
کوئی فردا کے تصور میں مگن
کوئی امروز کے غم سے بے حال
ڈھل گئے سائے میں کوئی شاداب
ہجر کی دھوپ میں کوئی مغموم
بیٹیں لے کے گزرتے ہیں لوگ
شادیانے بھی سنا کرتا ہوں
سب کے غم ہیں مرے سینے میں نہاں
سب کی خوشیوں کا امیں بھی ہوں میں
روز اول سے ہوں یوں ہی پامال
ٹھوکریں سہتا ہوں سب کی، پھر بھی
سب کو منزل کا پتہ دیتا ہوں!

اماوس کی رات

آزاد گلاٹی

شب کی لامحدود وسعت میں اکیلا
سوئی ہوئی راہگزاروں پہ
بھٹکتا پھر رہا ہوں
اور ہستی کے خلا کی پورنما میں
تیری یادوں کا دمکتا چاند ابھارے
سوچتا ہوں
وقت کی ٹھوکر سے تھالی چاندنی
خالی نہ ہو جائے
اور مری آنکھوں سے اشکوں کے ستارے
ٹوٹ کر
زندگی کی بے کراں ظلمت میں تاروں کی طرح
ہر طرف بن کر شرارے
رات بھر دہکا کریں

اور ہستی کا خلا
آج کی سی اک اماوس رات ہی میں ڈھل نہ جائے!!

زبان کا مسئلہ اور اردو

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں زبان کے مسئلہ کو سنٹ بازیوں پر قربان کیا جارہا ہے۔ اور یہ تاریخ کی بہت بڑی ٹریجیڈی ہے کہ زبان کے جھگڑے میں جہاں چھوٹی سے چھوٹی زبان کی ترقی کی صورت پیدا ہورہی ہے وہاں اردو جیسی ترقی یافتہ زبان کو بری طرح ختم کیا جارہا ہے اس بات کے باوجود بھی آج ملک میں کروڑوں انسان اردو بولتے ہیں اور اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں آج بھی اردو روز ناموں کی اشاعت دوسری کئی زبانوں میں شایع ہونے والے روز ناموں سے زیادہ ہے۔ لیکن سرکاری اور سیاسی سطح پر اردو کا کوئی پرسان حال نہیں۔

اردو زبان کے حامیوں کو ہندی سے کوئی جھگڑا نہیں ہے اور یہ بات بالکل سیدھی سادی ہے کہ انگریزی کی جگہ ہندی لے سکتی ہے۔ ہندی کے سوا کسی دوسری زبان میں ملک کی قومی زبان بننے کی صلاحیت نہیں لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہندی کی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ اردو کو ختم کردیا جائے۔

پنجاب میں جہاں اکثریت آج بھی اردو لکھنا پڑھنا جانتی ہے ہندی اور پنجابی کے جھگڑے میں اردو کا خاتمہ کردیا گیا۔ اترپردیش میں جو صدیوں اردو کا گہوارہ رہا چیف منسٹروں کی کانفرنس کے فیصلہ کی کھلے بندوں مخالفت کی گئی۔ ریاستی سرکار نے اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے سے بھی انکار کردیا۔ تلنگ بھاگ میں یہی حالت بہار میں ہے اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے اگر یہی حالت رہی تو پندرہ بیس برس بعد اس ملک میں اردو کی حیثیت سنسکرت، عربی اور فارسی کی طرح ایک کلاسیکل زبان کے طور پر رہ جائے گی یا اس زبان کا افسوسناک حشر ہوگا جو اس ملک میں پیدا ہوئی جسے تمام فرقوں نے نشوونما دی، جو آج بھی ہندوستان کی چند ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور جسے بولنے والے ملک کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔

لاکھوں انسانوں کے نزدیک اردو کا زندہ رہنا ان کیلئے اقتصادی طور پر بہت ضروری ہے اس لیے کہ جو لوگ محض اردو جانتے ہیں اور اردو ہی ان کے روزگار کا ذریعہ ہے اردو کے خاتمہ پر وہ بے کار ہو جائیں گے اردو کا خاتمہ ملک کو نہایت بیش قیمت ادبی اور کلچرل سرمایہ سے محروم کردے گا۔ اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر ہمارے رہنماؤں نے اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس نہ کیا تو اردو کے مسئلہ پردوں کے اندر جو آگ سلگ رہی ہے وہ ایسے حالات پیدا کردیگی جو مدراس اور دوسرے مقامات پر پیدا ہو رہے ہیں۔

ہمارے رہنما تامل بنگالی اور دوسری علاقائی زبانیں بولنے والوں کو یقین دلانے کے لیے بے چین دکھائی دیتے ہیں کہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کے چند دنوں ان زبانوں کو دبی انگریزی کو کوئی گزند پہنچے گی لیکن انھوں نے اردو کے معاملے میں مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ کیا ہمارے رہنما یہ چاہتے ہیں کہ انھیں حرکت میں لانے کے لیے اور انصاف کے راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرنے کے لیے اردو کے حامیوں کو سیاسی ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

(اداریہ سویرا)

(صفحہ ۲ سے آگے)

انتشار و افتراق کی صورتیں رونما ہونے لگی تھیں انھوں نے قومی و ملی اتحاد کی بقا اور استحکام کے پیش نظر اس کی کھل کر مذمت کی اور اس سے اپنی شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا ۔ اردو ہندی جھگڑے کو جس طرح ہوا دیا گیا ہے ، وہ اس سے بے خبر نہیں تھے کہتے ہیں ؎

ہم اردو کو عربی کیوں نہ کریں ، اردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
بحثوں کے لیے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں

اس جھگڑے سے قبل اردو ہی صحیح معنوں میں ملک کی واحد مقبول عام زبان تھی لیکن جب اس میں رفتہ رفتہ عربی و فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت کے ادق اور نامانوس الفاظ داخل کیے جانے لگے تو اس کے نتیجے میں ایک دوسری نئی زبان ہندی جنم لے گئی[1] جو بعد میں نمایاں ہو کر اردو کی حریف بن گئی اس جھگڑے کے پیچھے جو مقاصد اور عوامل کار فرما تھے اور اس کو جن عناصر نے برپا کیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ، اکبر نے بڑے پر لطف انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے اور ان لوگوں پر جو زبان کے مسئلے کو خواہ مخواہ الجھانے کی کوشش کرتے ہیں ، طنز کا بڑا گہرا اور بھرپور وار کیا ہے ، وہ اس معاملے میں پوری رواداری برتنے کی تلقین کرتے ہیں ، ورنہ اتحاد وطن کی گتھی بھی سلجھنے کو نہیں ہے ؎

کہتا ہے مجھ کو جو کچھ سننے گا اس صدی میں
پوچھا کہ اس صدی میں کیوں چپ ہو گئے ہیں
بولے کہ یہ صدی ہے اس بحث اور بیاں میں
کہتا ہے جو کہیں ہم وہ کون سی زباں میں
سن کر یہ بات ان سے ہر اک کو آیا چکر
اک صاحب بصیرت چلتے ہوئے یہ کہہ کر
پیر فلک نہ کیوں کر اب باب بحث کھولے
جیتے رہیں گرو جی زندہ رہیں یہ بھولے

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ زبان کا مسئلہ جو خالص سیاسی و سماجی مسئلہ ہے اس کو غلط مذہبی رنگ دے کر کس طرح تعصب و تنگ نظری کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے ، اکبر اس معاملے میں تعصب و تنگ نظری کے مظاہرے کی شدید مذمت کرتے ہیں ، انھوں نے زبان کے مسئلے پر ایک سچے محب وطن کے نقطۂ نظر سے غور کیا ہے اور اسی لیے وہ ان لوگوں پر جو اس کو مذہب کی عینک سے دیکھتے ہیں ، طنز و تضحیک کا بھرپور وار کرتے ہیں اردو کہ جو لوگ مسلمانوں کی زبان کہہ کر اس کو دیس نکالا دینا چاہتے ہیں ، ان کے متعلق اکبر کی گل افشانی ملاحظہ کیجیے ؎

یہ کہتے تھے اک لالہ باوقار
کہ عربی حروف اب تو ہم پہ ہیں بار
رکی ہے انہی سے ہماری نمود
یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا حرام اور کہاں کا حلال
ہٹے جائے حقی رہیں رام لال

اردو ہندی جھگڑے کے سلسلے میں ان کے کئی اور بھی نکتے بڑے ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں ؎

معنیٔ جنگ اردو و ہندی — میں یہ سمجھا یہ عالم رندی
بحث ہے اس میں لطف وصل بتاں — خوب مل کر رہی زباں سے زباں

علم پر بھی عشق کی تاثیر آخر پڑ گئی
نکتے کی بات پیا کے دلوں میں گڑ گئی
وصل کی شب میں نے اس لب سے لڑائی جب زباں
یہ اثر اس کا ہوا اردو سے ہندی لڑ گئی

انھوں نے رسم خط کے مسئلے پر بھی بڑے پر لطف انداز میں اظہار خیال کیا ہے جو لوگ اردو رسم خط کو ناقص اور اس کے مقابلے میں دیوناگری رسم خط کو بہتر اور قابل ترجیح قرار دیتے ہیں ، اکبر ان کو اس طرح آئینہ دکھاتے ہیں ؎

بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ ہو — بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بس کہ لکھا ہے اعمال مرا ہندی میں — کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

اکبر کے یہاں اس موضوع پر اور بھی بہت سے دلچسپ اور بصیرت افروز نکتے مل جاتے ہیں انھوں نے اس مسئلے پر وسیع تر قومی و تہذیبی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے اور اس کے دوسرے جزوی اور شخصی یا ذاتی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں ، دوسرے معاملات و مسائل کی طرح اس معاملے میں بھی ان کا مقصد اختلاف اور کشمکش کو ختم کر کے اتحاد و مفاہمت کی فضا پیدا کرنا رہا ہے اس لحاظ سے یہ موضوع اکبر کی شاعری میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے جو دلچسپ نکتے پیش کیے ہیں ، ان کی افادیت اور قدر و قیمت ہر زمانے میں محسوس کی جائے گی ۔

[1] یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کے لیے کسی ثبوت کے فراہم کرنے کی ضرورت نہیں جدید ہندی کا اودھی اور برج بھاشا کے سرمائے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں جسے ثابت کرنے کی ہندی والوں کی طرف سے اب تک مضحکہ خیز کوششیں ہوتی رہی ہیں (۱۰-۱۱)

مراسلات

شہید اعظم

"ہماری زبان" کی یکم مئی کی اشاعت میں "شہید اعظم" کے متعلق ابو سلمان شاہ جہاں پوری کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ یہ دوسرا مراسلہ ہے جو اس موضوع پر شائع ہوا ہے۔ عام خیال اب تک یہ تھا کہ "شہید اعظم" مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ہے لیکن ابو سلمان صاحب نے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ "شہید اعظم" مولانا ابوالکلام آزاد کی نہیں بلکہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیف ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو دلائل دئے ہیں وہ بڑی حد تک اُن کے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الہلال میں شائع شدہ بہت سارے مضامین ایسے ہیں جو مولانا آزاد کے نہیں بلکہ ان کے شرکائے کار کے ہیں لیکن پھر بھی انھیں آج مولانا آزاد کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب کوئی دانستہ سازش یا بددیانتی نہیں بلکہ صریحاً مغالطہ ہے جس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ "الہلال" میں ادارے کی طرف سے جو مضامین شائع ہوتے تھے ان پر کسی کا نام درج نہیں ہوتا تھا، اسی لیے آج یہ تمیز کرنے میں دشواری ہو رہی ہے کہ ان میں کون سے مضامین کس کے ہیں۔ کوئی واضح بدیہی نشان نہ ہونے کے سبب سے لامحالہ یہ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے منسوب کیے جا رہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مضامین پر "ہلالی رنگ" اس قدر چھایا ہوا ہے کہ بظاہر یہ شبہ کرنا ناممکن ہے کہ یہ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ کسی اور کے بھی ہو سکتے ہیں۔

یاد آتا ہے کہ مولانا سلیمان ندوی مرحوم نے "معارف" کے کسی شمارے میں (اس وقت سن اور تاریخ ٹھیک ٹھیک یاد نہیں) "جس سے میں متاثر ہوا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ "الہلال" میں شائع ہونے والے کچھ مضامین ان کے بھی ہیں جنھیں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی صاحب جو اس زمانے میں "مدینہ" کے اڈیٹر تھے، جب مولانا سے ملے اور ان سے سید صاحب کے اس دعوے کا تذکرہ کیا تو مولانا نے اس کی تصدیق کی اور ساتھ ہی فاروقی صاحب کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ سید صاحب سے پوچھ کر جو مضامین ان کے ہوں ان کا اعلان ان کی طرف سے "مدینہ" میں کر دیں۔ (ضیاء الحسن صاحب نے "مدینہ" میں "امام الہند کے ساتھ چند لمحے" کے عنوان سے اس ملاقات کی پوری روداد تفصیل سے لکھی ہے) لیکن اس طرح کا کوئی اعلان میری دانست میں، آج تک کبھی منظر عام پر نہیں آیا اور نہ پھر کسی نے اس کی کچھ کھوج خبر لی۔ چنانچہ اب تک یہ عقدہ نہیں کھل سکا کہ "الہلال" میں شائع شدہ کون کون سے مضامین واقعتاً سید صاحب کے ہیں۔ سید صاحب نے اپنے مضمون میں اس امر کی بھی صراحت کی تھی کہ "الہلال" سے وابستگی کے دور میں انھوں نے جو مضامین (الہلال میں) لکھے ہیں ان میں "الہلال" کے مخصوص صحافتی رنگ اور سطح کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے ان میں "ہلالیت" نمایاں ہے۔ کیا عجب ہے کہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی "الہلال" میں جو مضامین لکھے ہوں، ان میں سید صاحب ہی کی طرح "الہلال" کے رنگ کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہو، پھر مولانا آزاد کی اصلاح و ترمیم نے ان مضامین پر ان کے اسلوب کی چھاپ اور بھی گہری کر دی ہو۔ پس اس صورت میں اگر "شہید اعظم" پر مولانا آزاد کے قلم کا دھوکہ ہوتا ہے تو کیا تعجب ہے؟

بہتر ہو کہ ہمارے محققین ادب اس جانب توجہ دیں اور ان تمام خارجی اور داخلی شہادتوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کریں جن سے اس معاملے میں کسی واضح اور قطعی نتیجہ پر پہنچنے میں مدد مل سکے، اور آئندہ کسی مغالطے کی گنجائش نہ رہ جائے۔ یہ کام وقت اور محنت چاہتا ہے لیکن پھر بھی کرنے کا ہے۔ اگر ہمارے محققین اس کام کو انجام دے سکیں تو وہ ایک اہم تاریخی ادبی اور تحقیقی فریضہ کی تکمیل کریں گے جسے اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

(ابوذر عثمانی)

نوٹ:۔ "آزاد کی کہانی" میں عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ ان کے کئی مضمون "الہلال" میں شائع ہوئے تھے۔ ادارہ

مفتی سید احمد علی صاحب بقید حیات ہیں

فروری ۱۹۶۵ء کے "ہماری زبان" (صفحہ ۳ - کچھ گلکدۂ عزیز کے بارے میں) میں جناب مفتی سید احمد علی صاحب قبلہ مدظلہ کو مرحوم لکھا گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ موصوف ما شاء اللہ بقید حیات ہیں۔

(ڈاکٹر سید سلیمان لکھنؤ)

ریاض خیرآبادی

میں ریاض احمد ریاض خیرآبادی پر تحقیقی کام کی سعی زیر نگرانی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ... یونیورسٹی کر رہا ہوں۔ مجھ کو اس سلسلے میں "گلکدۂ ریاض"، "ریاض الاخبار"، "فتنہ"، "عطر فتنہ"، "گلچیں" وغیرہ کی ضرورت ہے۔ قلمی نسخے اور دیگر مواد درکار ہیں۔ جو صاحبان ان کو فراہم کر دینے میں مدد کر سکتے ہیں یا نشان دہی کر سکتے ہیں، ان کا میں بہت شکر گزار ہوں گا۔

(خلیل اللہ خاں مجرد ... گورکھپور)

مثنوی عشق نامۂ منظوم کی تلاش

اگر کسی صاحب کی نظر سے واجد علی شاہ اختر والی اودھ کی اردو مثنوی موسومہ "عشق نامۂ منظوم" گزری ہو تو مجھے مطلع فرمائیں کہ وہ

کہاں ہے۔ یہ مثنوی مطبع سلطانی لکھنؤ سے چھپ چکی ہے۔ میں اس اطلاع کے لیے بے حد شکر گزار رہوں گا۔

(اکبر علی خاں۔ رضا لائبریری رام پور یوپی)

جامعہ اردو کے امتحانات

جامعہ اردو کے امتحانات بابت ۱۹۶۶ء کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ طلبہ و طالبات مقامی طور پر اپنے مراکز یا ملحقہ اداروں سے فارم اور ضروری اطلاعات حاصل کر سکتے ہیں یا براہ راست جامعہ اردو کے دفتر سے رجوع کر سکتے ہیں۔

رجسٹرار جامعہ اردو ایسے مقامات کے محبانِ اردو کی توجہ بھی جامعہ اردو کے امتحانات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جہاں اب تک امتحانات کے سنٹر قائم نہیں ہوئے ہیں۔ نئے مقامات کے جو حضرات جامعہ اردو کی خدماتِ اردو سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ رجسٹرار جامعہ اردو کو براہ راست خط لکھیں تاکہ ان کی خدمت میں جامعہ اردو کا ضروری لٹریچر ارسال کیا جائے۔ (رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ)

یوم سریر

فردوسیٔ ہند بلبل بہار علامہ سریر کابری (مرحوم) کی یاد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ جولائی کے آخری ہفتہ میں ہونے جا رہا ہے۔ اردو کے شیدائیوں سے پرخلوص استدعا ہے کہ دامے درمے سخنے قدمے سے انجمن کی حوصلہ افزائی فرمائیں۔

(مختار احمد عاصی داناپوری سکریٹری بزم سریر گیا)

واجد علی شاہ کی ایک مثنوی کے بارے میں

۲۲ر جون کے 'ہماری زبان' میں واجد علی شاہ کی ایک مثنوی کے بارے میں اکبر علی خاں صاحب کا ایک استفسار چھپا ہے جس میں تاریخ اودھ مصنفہ نجم الغنی کے حوالے سے دو شعر اختر کی ایک مثنوی سے لیے گئے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں۔ یہ ان کی مثنوی 'عشق نامہ' سے مقتبس ہیں جس کا ایک انتخاب مطبع گلشن مولوی گنج سے خواجہ محمد ولی جان عاصی نے خاقان سرور کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ نسخہ الٰہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ میری کتاب اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں جسے الٰہ آباد یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، اس سلسلے میں صفحات ص۱۹۳، ص۱۹۴، ص۲۰۲، ص۲۰۳، اور ص۲۱۳ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں جب میں اس موضوع پر کام کر رہا تھا، 'عشق نامہ' کا ایک ناقص نسخہ مجھے ملا تھا لیکن صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اسے بھی خاقان سرور ہی سمجھا۔ چنانچہ اس شبہ کا اظہار کتاب میں موجود ہے۔ اسی مثنوی میں وزیرن طوائف کے بادشاہ اور ان کے بھائی سے عشق کی مشہور داستان بھی منظوم ہے جس میں ایک ہی وقت میں سکندر مرزا اور واجد علی شاہ سے وزیرن کا عشق دکھایا گیا ہے ؎

بیں مسند نشیں اور حضرت قریں
برادر مرے پاس پہلو نشیں
لگی عشق کی اک مرے دل کو چوٹ
برادر مرے ہو گئے لوٹ پوٹ
کیے ایک صیاد نے دو شکار
کیے ایک ناوک نے دو دل فگار
عجب سحر چشم ستم گر چلا
ادھر بھی ادھر بھی برابر چلا

اس واقعے کا تذکرہ 'محل خانۂ شاہی' مرتبہ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی میں بھی بیان چھبیسواں ص۹۲ پر ملتا ہے۔ محل خانۂ شاہی میں سکندر مرزا کو مرزا اسکندر حشمت لکھا گیا ہے۔ 'محل خانۂ شاہی' جو تاریخ پری خانہ کا اردو ترجمہ ہے اس کے بہت سے واقعات اس مثنوی میں ملتے ہیں۔

(ڈاکٹر سید محمد عقیل)

عشق نامہ منظوم

اکبر علی خاں صاحب نے جس مثنوی کے بارے میں استفسار فرمایا ہے وہ مثنوی عشق نامہ منظوم ہے۔

یہ مثنوی پہلی بار مطبع سلطانی سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں وہی حالات و واقعات نظم کیے ہیں جو واجد علی شاہ مرحوم نے اپنی نثری تصنیف عشق نامہ میں تحریر کیے ہیں۔ ایک اس کا خلاصہ خواجہ محمد ولی جان عاصی نے انتخاب سرور کے نام سے مطبع گلشن فیض مولوی گنج لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ سید محمد علی خاں ہلال نے وزیر نامہ میں اور مولوی نجم الغنی مرحوم نے تاریخ اودھ جلد پنجم میں اسی مثنوی کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ اشعار کی تعداد تخمیناً ۸ ہزار ہے۔

'عشق نامہ' واجد علی شاہ کے نجی حالات و واقعات کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ مثنوی کی اہمیت صرف سوانحی ہے کہیں کہیں اچھی شاعری کی بھی مثالیں مل جاتی ہیں۔

ذیل میں حاجی خانم سے متعلق اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جس کی عمر بائیس سال کی تھی اس کا سراپا یوں بیان کیا ہے ؎

بہت شوخ تھی گرم تھی شنگ تھی — سر دست چنچل سے وہ خوش رنگ تھی
عجب خوشنما تھا وہ قد دراز — ادا بھول جائے جہاں سرو ناز
بلا خیز چشم سیاہ فام تھی — کہ گردش میں وہ دور ایام تھی
لبوں پر مسی یوں نمایاں ہوئی — کہ اظہار شام غریباں ہوئی
غرض کر پڑی جب کہ پہلی نظر — نشانہ ہوا تیر غم کا جگر

(ڈاکٹر سید سلیمان حسین لکھنؤ)

آل پارٹیز اردو کنونشن میرٹھ

میرٹھ ۲۶ رجون:- آج یہاں فیض عام انٹر کالج میں آل پارٹیز اردو کنونشن کا اجلاس عام بصدارت پنڈت سندر لال منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم پی نے افتتاح کیا۔ اجلاس عام کے شرکا میں یو۔پی کے مختلف اضلاع کے نمائندے اور اردو کے ممتاز ادیب اور یو۔پی ریاستی اسمبلی و پارلیمنٹ کے ممبران موجود تھے۔ دس ہزار سے زائد کا مجمع تھا۔

تالیوں کی گونج میں مسٹر گوپی ناتھ سنہا نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ یو۔پی کی حکومت نے جس پھرتی کے ساتھ اردو کو ختم کیا ہے وہ پھرتی کسی اور کام میں نہیں دکھائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد حکومت کا سب سے اہم اور پہلا کام اردو کو تباہ کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر اردو مستقل زبان نہیں تو اسے دستور میں قومی زبانوں کی فہرست میں کیوں جگہ دی گئی۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت سے اردو کو انصاف کی امید نہیں۔ اردو کے تحفظ کے لیے آپ نے مرکز سے مداخلت کی اپیل کی۔

آپ نے کہا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ تقسیم سے قبل کے فیصلے تقسیم کے بعد قابل عمل نہیں رہے تو یہ کوئی اچھی منطق نہیں ہے۔ یہ تحریک آزادی کے وقت کیے گئے وعدوں کے مطابق ہے۔

پنڈت سندر لال نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اتر پردیش میں ۹۰ فیصد باشندوں کی بول چال کی زبان وہ ہے جس کو ہم اردو کہتے ہیں۔ اور جو کبھی ہندی کہلاتی تھی لیکن یہ وہ زبان نہیں ہے جس کو آج کل ہندی کہتے ہیں۔ زمانہ کے تھپیڑے کھا کر ہم نے اکثریت کی جگہ اقلیت میں ہونا منظور کر لیا لیکن اقلیتوں کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے

دستور کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ دفعہ ۳۴۷ میں کہا گیا ہے کہ اگر صدر جمہوریہ کو اس بات کی تسلی ہو جائے کہ کسی صوبہ میں ایک معقول تعداد چاہتی ہے کہ کسی زبان کو خاص مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو صدر جمہوریہ اس بات کے ہدایت نامے جاری کر سکتے ہیں کہ ہدایت نامہ میں درج اغراض کے لیے اس زبان کو استعمال کیا جائے

آپ نے کہا کہ دستور کی اس دفعہ کا اکثریت کی تسلیم شدہ علاقائی زبان سے کوئی تعلق یا ٹکراؤ نہیں۔ آپ نے کہا کہ اردو کی قدم قدم پر حق تلفی ہو رہی ہے۔ اردو بولنے والی اقلیت کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ کنونشن کی تقریروں میں اس کا کافی چرچا ہوگا، اس وقت میں ایک دو باتوں کا تذکرہ کروں گا۔

یو۔پی اسمبلی کے اندر، اور لکھنؤ جیسے شہر میں ڈاکٹر فریدی کو تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہم سب کے دل پر اس سے زبردست زخم لگا ہے۔ سہ لسانی فارمولے پر جس طرح عمل کیا جا رہا ہے، وہ نہ انصاف ہے نہ ایمانداری۔ اس کی خاص غرض یہ تھی کہ ہر بچہ کو اپنی مادری زبان میں تعلیم کا موقع ملے لیکن آج اس صوبہ کے لاکھوں بچے جن کی مادری زبان اردو ہے اپنی مادری زبان کی تعلیم سے محروم ہیں وہ دنیا کی کوئی بھی زبان سیکھ سکتے ہیں لیکن اپنی مادری زبان کی تعلیم نہیں پا سکتے۔

آپ نے فرمایا کہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کے حق میں اب تک ہدایت نامہ جاری نہیں کیا گیا ہے۔ اس وقت تک اردو والوں کی شکایت دور نہیں ہو سکتی۔ صدر جمہوریہ سے ہدایت نامہ جاری کرنے کی درخواست ۲۲ لاکھ دستخطوں سے کی گئی تھی۔ اس طرح کے مطالبہ نامہ پر ۲۲ لاکھ بالغوں کے دستخطوں کا مطلب ہے ایک کروڑ عورتوں بچوں، بوڑھوں، جوانوں کی طرف سے اس مطالبہ کی حمایت۔ لیکن صدر جمہوریہ یا حکومت کی طرف سے اب تک یہ بھی نہیں کہا گیا کہ ہدایت نامہ جاری کرنے کے لیے یہ تعداد معقول نہیں

۲۷ رجون:-

پاکستان کی جارحیت کی مذمت اردو کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کرنے اور حکومت یو۔پی سے پرائمری و ثانوی اسکولوں کے لیے اردو کی درسی کتابوں اور اردو استادوں کی ٹریننگ کا اہتمام کرنے کی قراردادوں کے علاوہ مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی گئیں۔

تجویز نمبر ۱:-

آل پارٹیز یو۔پی اردو کنونشن میرٹھ کا یہ اجلاس امر حقیقت پر شدت کے ساتھ احتجاج کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ہندوستانی دستور کی شیڈول آٹھ میں درج ۱۴ قومی زبانوں میں شامل اردو زبان کو ابھی تک یو۔پی کی علاقائی زبان تسلیم نہ کرکے حکومت یو۔پی اور حکومت ہند نے اردو کے ساتھ وہ منصفانہ سلوک نہیں کیا جو کہ مذکورہ شیڈول میں شامل دوسری زبانوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے حالانکہ خود حکومت ہند نے اپنے لسانی پالیسی سے متعلق بیان مجریہ جولائی ۱۹۵۸ء میں تسلیم کیا تھا کہ اردو سرکاری طور پر ہماری قومی زبان ہے۔

یہ کنونشن اس حقیقت پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ اردو زبان کے ساتھ مسلسل ہونے والی بے انصافی کی روک تھام کے لیے ۲۲ لاکھ دستخطوں سے محبان اردو کی اس عرضداشت پر جو کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے پیش کی گئی اور ان میمورنڈموں پر جو کہ ۱۰۴ ممبران پارلیمنٹ اور ۲۰۵ ممبران اسمبلی یو۔پی نے صدر جمہوریہ ہند کو بھیجے تھے کوئی کارروائی اب تک نہیں کی گئی۔

یہ کنونشن صدر جمہوریہ ہند سے نہایت ادب کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان عرضداشتوں کا جلد از جلد جواب دیں اور اگر آپ سے تین ماہ کے اندر جواب نہیں ملتا ہے تو یہ کنونشن حسب ذیل کمیٹی کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ پرامن اور عدم تشدد کے اصولوں پر مبنی ایک تحریک شروع کرے جس میں مندرجہ ذیل ہدایت کو مد نظر رکھا جائے۔

نمبر (۱): ملک میں حکومت سے عدم تعاون کی تحریک شروع کی جائے۔"

نمبر (۲) ان جماعتوں کے امیدواروں کو جو کہ اردو کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھ کر اسے انتخابی منشوروں میں شامل نہیں کریں ووٹ نہ دیے جائیں۔

نمبر (۳) ارکان مجالس قانون ساز سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ایک بل اردو کو علاقائی زبان منوانے کے لیے پیش کریں اور ناکامی کی صورت میں جو پارٹیاں اس ناکامی کے لیے ذمہ دار ہوں ان کے ممبران پر زور دیا جائے کہ وہ پارٹی سے مستعفی ہوں اس کا طریقہ کمیٹی طے کرے۔

نمبر (۴) یوم احتجاج منایا جائے اور یوم احتجاج منانے کا طریقہ کمیٹی طے کرے۔

نمبر (۵) اضلاع کی سطح پر لوکل باڈیز کے وہ ممبران جو کہ اردو کے حامی ہیں اپنے لوکل اداروں کے ساتھ اردو زبان میں رابطہ قائم کریں۔

نمبر (۶) عام محبان اردو اپنے نمائندوں سے مطالبہ کریں کہ وہ تحریری امور میں اردو کے استعمال کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں۔

سب کمیٹی نے بعد کو صدر کنونشن اور استقبالیہ کے عہدیداروں اور سرکردہ حضرات کے مشورہ سے ایکشن کمیٹی کے لیے مندرجہ ذیل نام تجویز کیے۔

ڈاکٹر فریدی، محترمہ انیس قدوائی، مسٹر شرافت حسین ایم۔ ایل۔ سی، جناب جمیدی لال ماتھی ایم۔ ایل۔ سی، حافظ علی بہادر خاں صاحب، مفتی محمد طیب صاحب، بہار برنی،

صدر کو اختیار دیا گیا کہ چار نمائندے اپنی صوابدید کے مطابق نامزد کریں اور ریاستی سیاسی پارٹیوں کے صدر دفتروں سے رابطہ قائم کرکے ان کے ۵ نمائندے کمیٹی میں شامل کرلیں۔"

تجویز نمبر ۲:

یہ اردو کنونشن اس بات پر انتہائی افسوس کرتا ہے کہ سہ لسانی فارمولے کی شق (الف) پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اس شق (الف) کی رو سے علاقائی زبان کے ہی ساتھ ایسی صورت میں کہ مادری زبان علاقائی زبان سے مختلف ہو، مادری زبان کا پڑھایا جانا بھی ضروری قرار دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ کنونشن حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اردو داں طبقہ کے بچوں کے لیے مادری زبان کا پڑھایا جانا قانون کے ذریعہ لازمی قرار دیا جائے اور ہر اس بچہ کے لیے جس کی مادری زبان اردو ہے اردو زبان کا پڑھانا لازمی قرار دے۔

تجویز نمبر ۳

اردو داں کو اس بات کا فخر اور اعزاز حاصل ہے کہ ہندستان کے اندر انگریزی دور کے آغاز سے لے کر اس وقت تک ہر مرحلہ پر سیاسی، سماجی موڑ پر اور ہر ہنگامی دور میں ملک اور قوم کی جو خدمت اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ محبان اردو نے انجام دی ہیں وہ کسی بھی دوسری زبان والوں کے مقابلہ میں نمایاں طور پر زیادہ ہیں اردو زبان کی اس حیثیت پر بھی فخر ہے کہ اس نے جنگ آزادی میں انقلاب زندہ باد، جیسا نعرہ دیا جس کا بدل کوئی آج بھی نہیں ہے پھر جب ۱۹۶۲ء میں چین نے ہندوستان کی شمالی سرحدوں پر حملہ کیا تو اردو قلمکاروں، شاعروں اور ادیبوں نے دشمن کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے اور لوگوں میں جذبہ حب الوطنی کو ابھارنے کے لیے نمایاں رول ادا کیا اس وقت جب کہ چین کے بعد پاکستان نے بھی ہماری سرحدوں پر جارحانہ حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ یہ اردو کنونشن تمام اردو ادیبوں، شاعروں، اور صحافیوں اور دوسرے تمام اردو دوستوں سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی روایتی حب الوطنی سے کام لیتے ہوئے پاکستان کی جارحیت کے خلاف آواز بلند کریں رائے عامہ کو بیدار کریں۔ اور دشمن طاقتوں کے خلاف لوگوں کے اندر جذبہ بیدار کرنے میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں کہ جو ایک باوقار قوم کی خصوصیت ہوتی ہے۔

تجویز نمبر ۴

آل پارٹیز صوبہ یو۔پی اردو کنونشن کا یہ اجلاس عام ہندوستان بھر کی مختلف انجمنوں سے عموماً اور صوبہ یو۔پی کے ادبی اداروں سے خصوصاً یہ اپیل کرتا ہے کہ ایک ایسے نازک وقت میں جبکہ اردو کی تحفظ کی جدوجہد فیصلہ کن منازل سے گذر رہی ہے، آپسی اختلافات کو ختم کر دیں۔ اور اردو کنونشن کو عملی جامہ پہنائے جانے کے سلسلہ میں کنونشن کی جانب سے موصول شدہ ہدایات پر پوری طرح عمل کریں تاکہ اردو صوبہ یو۔پی میں مناسب مقام حاصل کر سکے۔　(الجمعیۃ دہلی)

پربھنی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ قائم کر دی گئی

مہاراشٹر کے اردو دوستوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ پربھنی میں بھی قائم کر دی گئی۔ یہ پربھنی کے اردو دوستوں سے درخواست ہے کہ اردو کے مقاصد کو تقویت پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ پربھنی کے ممبر بنیں۔

رکن سازی کے فارم حاصل کرنے کا پتہ:-

جناب محمد مظفر علی خاں صاحب نائب صدر، انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ پربھنی۔ علاقہ مرشواڑہ۔ پربھنی

(م۔ ی۔ کھتری، شعبۂ نشر و اشاعت، انجمن ترقی اردو (ہند) مراٹھواڑہ) مرسلہ

اردو یونی ورسٹی کی تجویز

اہلِ اردو سے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی اپیل

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے چودہ زبانوں کے حق میں جو فیصلہ دیا ہے اس کے متعلق بہت سی مخالف اور موافق رایوں کا اظہار کیا گیا ہے لیکن میرے خیال میں اگر اس فیصلہ پر ایمانداری اور خلوص نیت سے عمل کیا گیا تو وہ اردو کے لیے کافی نیک بات ہوگی۔

اس فیصلہ کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً چودہ زبانوں میں یونی ورسٹیاں قائم ہوں گی۔ اردو والوں کو بھی چاہیے کہ وہ مایوسی اور بے عملی کو چھوڑ کر اردو یونی ورسٹی کے قیام کے لیے پوری پوری جد و جہد کریں۔

یہ تجویز کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی یا جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اردو یونیورسٹی کا نام دے دیا جائے بہت ہی غیر دانشمندانہ ہے۔ اول تو میں نہیں چاہتا کہ اردو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی نشانی اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے اسے کسی ایسے ادارے سے وابستہ کر دیا جائے جس کا کردار اور جس کی نوعیت اور حیثیت پہلے سے متعین ہے۔ یہ اس کے آئین کے ساتھ بے وفائی ہوگی اور یہ اقدام اردو کی سیکولر تحریک اور اس کی غیر مذہبی تہذیب کے بھی منافی ہوگا۔ جس زمانہ میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہوا ہے، دلی میں ایک میڈیکل کالج قائم ہونے والا تھا اور اس کے سارے مراحل طے ہو چکے تھے۔ یاروں نے زحمت سے بچنے کے لیے اس بنے بنائے کالج کا نام مولانا آزاد میڈیکل کالج رکھ دیا۔ پنڈت جی نے اس روش کی سخت مذمت کی تھی۔ اس لیے اگر آپ کو اردو سے سچی محبت ہے تو نئے ہندوستان میں ایک علیحدہ اردو یونی ورسٹی قائم کیجیے جس کی ایک ایک اینٹ سے آپ کو جذباتی لگاؤ ہو، جو ہماری مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہو، جو اردو کے اتحاد پسندانہ کردار کی مظہر ہو اور جو نئے ہندوستان میں علم کا سب سے اونچا شوالہ ہو۔

یہ کام ہو سکتا ہے۔ کچھ مشکل نہیں ہے۔ صرف آپ کی ہمت کی ضرورت ہے۔ ابھی آپ نے عزم انسانی کے معجزے دیکھے نہیں۔ اسی ہندوستان میں آزادی کے بعد اردو کا روزنامہ ملاپ تین جگہوں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے یہ شرف آج تک کسی اخبار کو حاصل نہیں ہوا۔ اسی طرح روزنامہ تیج دہلی آفسٹ میں شائع ہوتا ہے۔ ایوان اردو اور اردو ہال آزادی کے بعد ہی وجود میں آئے ہیں۔ اسی ہندوستان سے ہندوستانی بک ٹرسٹ نے ایسی کتابیں شائع کی ہیں جن کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اسی ہندوستان میں پہلی بار آزادی کی جوبلی منائی گئی ہے۔ اسی ہندوستان میں کم و بیش چودہ یونیورسٹیوں میں اردو کا کام ہو رہا ہے، اردو کے کئی ڈگری کالج ہیں اور کئی یونی ورسٹیاں ہیں جو اردو میں جواب لکھنے کی سہولت بہم پہنچاتی ہیں۔

اس وقت آپ کی ہمت اور آپ کے عزم و حوصلہ کا امتحان ہے۔ اگر اردو سے محبت رکھنے والوں کی تعداد سات آٹھ کروڑ بھی ہے، اور وہ اردو کے لئے صرف ایک روپیہ بھی زندگی میں ایک بار دینا طے کر لیں تو سات آٹھ کروڑ روپے بآسانی جمع ہو سکتے ہیں۔

اردو میں سائنسی علوم کی روایت شمس الامراء امیر کبیر ثانی اور قدیم دلی کالج کے وقت سے قائم ہے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے ذریعہ سترہ برس پہلے تک سائنسی علوم میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ سترہ برس کسی ملک کی زندگی میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ ان بنیادوں پر ایک نیا قصر بے قصور تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ صرف آپ کی ہمت کی ضرورت ہے۔ اور "توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے"۔

دوسرا کام یہ ہے کہ سہ لسانی فارمولے کا ہر ریاست میں اس طرح نفاذ کرائے کہ اس میں اردو کی گنجائش نکل آئے۔ اس فارمولے میں بعض ریاستوں نے قدیم کلاسکی زبانوں کو شامل کر لیا تھا جو سراسر غلط ہے۔ میں نے امریکہ سے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس فارمولے کی وضاحت چاہی تھی۔ انھوں نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ اس میں مندرجہ ذیل زبانیں شامل ہیں۔

(۱) کوئی جدید یورپی زبان جس میں انگریزی بھی شامل ہے۔

(۲) ہندی جو سرکاری زبان ہے۔

(۳) کوئی جدید ہندوستانی زبان جس میں لازماً اردو بھی شامل ہے۔

۱۷ جون کے اسٹیٹسمین دہلی ایڈیشن سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ وزارت تعلیم کے سامنے بھی سہ لسانی فارمولے کا یہی تصور ہے۔

اگر آپ کو نئے ہندوستان کے جمہوری کردار اور اس کے غیر مذہبی آئین پر یقین ہے تو یہ دونوں باتیں بآسانی عمل میں آ سکتی ہیں۔ ہمیں ان کو عمل میں لانے کے لیے پوری جد و جہد کرنا چاہیے۔ میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آپ کی جد و جہد لازمی کامیاب ہوگی اس لیے کہ یہ حق و صداقت پر مبنی ہے، اس لیے کہ اس سے ملک کی تہذیبی یکجہتی کی روایت وابستہ ہے۔ دوسرے اب حالات بدل رہے ہیں، موافق ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ یو۔پی کے ممبران اسمبلی نے اردو کے جائز حقوق کی حمایت کی ہے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے آئین کی چودہ زبانوں کو برابر کا حق دیا ہے جس میں اردو بھی شامل ہے۔ اور آئین کا دیا ہوا حق ہم سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی۔

تبصرے

ڈاکٹر نعمان احمد صدیقی

ہندوستان کی تاریخ بچوں کے لیے (اردو ایڈیشن)

پبلیکیشنز ڈویژن، منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند، نئی دہلی۔

زیر تبصرہ کتاب حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات و نشریات نے شائع کی ہے۔ وادی سندھ کے دھندلکوں سے ہندوستان کی آزادی کے حصول اور ہندوستان کی تشکیل کی لمبی کہانی ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت طباعت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے جس کی وجہ سے کتاب کی دیدہ زیبی میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ قیمت تین روپے پچیس پیسے۔ سرورق کو اور زیادہ خوب صورت اور بامعنی بنایا جا سکتا تھا۔

کتاب کا مقصد جیسا کہ دیباچہ کہا گیا ہے بچوں میں تاریخ کا شوق پیدا کرنا ہے۔ تاریخوں کے درج کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کی لمبی کہانی عام فہم اور سادہ زبان میں بیان کی جائے۔ اگرچہ تاریخیں نہیں دی گئی ہیں لیکن مروجہ ترتیب کے مطابق راجوں، بادشاہوں اور دوسرے فرمانرواؤں کا حال ترتیب وار درج ہے ساتھ ساتھ ہر دور کے علما، شعرا اور صنعتوں کا حال مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ہر عہد کے خاتمے پر لوگوں کی سماجی زندگی کا مختصر حال بھی ملتا ہے۔ کتاب کی اسی ترتیب کی بنا پر کتاب کہیں کہیں تاریخی کشکول بن کر رہ گئی ہے۔ اور تاریخی کہانی کا تسلسل برقرار نہیں رہا۔ ایسی صورت میں یہ کتاب بچوں کے لیے دلچسپ کہانی مشکل سے بن سکے گی۔

تاہم کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ [illegible] احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور ہندوستان کی طویل تاریخ کو ایک غیر جانبدارانہ اور قومی نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے کسی بھی حکمراں یا تہذیب کی بیجا تعریف یا مذمت نہیں کی گئی ہے۔ آج کی فضا کو دیکھتے ہوئے یہ قابل تحسین ہے۔

کتاب کے مصنف نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس کے مطالعہ سے بچوں میں تاریخ سے دلچسپی اور تاریخی شعور پیدا ہو۔ انھیں پتہ چلے کہ اس ملک میں بار بار منظم معاشرے وجود میں آئے اور بار بار ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر منظم معاشرے کے زوال کے بعد اس کی زندہ روایات، رسمیں اور قدریں نئے معاشرے کا جزو بن گئیں، اور آج کا ہندوستان اسی تاریخی عمل کے تکرار کا نتیجہ ہے۔ آج کے ہندوستان میں بہت سی تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں اور آریہ تہذیب کی سادگی کی چھاپ بھی۔ ہندو تہذیب کی روحانیت، نرمی اور سلوک ابھی تک باقی ہے۔ ہندو معاشرے کے سیاسی اور سماجی انتشار کے وقت مسلمان اس ملک میں آئے ان دو تہذیبوں اور معاشرت کے ٹکراؤ اور نفوذ سے ایک نئے معاشرے نے جنم لیا جسے قرون وسطیٰ کی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ آج کے ہندوستان میں اس سماج کی جھلک بھی موجود ہے مثلاً اردو اور ہندوستانیت۔

مغل حکومت کے زوال اور انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی عمل شروع ہوا۔ [illegible] مغربی [illegible] اور تہذیبی تمدن کے زیر اثر پرانی بنیادوں پر ایک نئے ہندوستان کی تشکیل شروع ہوئی ساتھ ساتھ ہندوستانی قومیت کے تصور نے جنم لیا۔ ان رجحانات اور سماجی قوتوں کے ٹکراؤ سے ہمارے آزاد اور جمہوری ہندوستان کی تشکیل ہوئی۔

بلاشبہ مصنف کا مقصد بچوں میں ایسی تاریخی شعور کو پیدا کرنا ہے۔ وہ خاطر خواہ اس بات کے لیے بھی کوشاں ہے کہ بچوں کو اپنے اس ہزاروں سالہ تاریخی ورثے پر فخر کرنا چاہیے۔ اور ان روایات کا احترام کرنا چاہیے جو ہندوستان اور ہندوستانیت کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ اگر بچوں کو یہ عرفان نصیب ہو جائے تو مصنف مبارکباد کا مستحق ہے۔ اور اس کی محنت بارآور ہوگی۔ مگر اس بات میں تھوڑا سا شبہ ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک فن کی ضرورت ہے جیسے وہ تاریخ کے فن کے لیے جو اور جیسے ہندوستانیت کے ہندو خیال کو پوری طرح اجاگر کرنے کے لیے۔ وہ فن اس کتاب میں کم نظر آتی ہے۔ کتاب کی اس خامی کی سب سے بڑی وجہ غالباً اس کا طرز بیان اور ترتیب ہے۔ بعض حصوں میں کتاب نے مختلف تاریخی کشکول کی شکل اختیار کر لی ہے جو نہ بچوں کے لیے دلچسپ ہو سکتی ہے اور نہ ان کے شعور کو روشنی بخشتی ہے۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے دو ایک باتیں اور کھٹکتی ہیں۔ نادانستہ اور غیر شعوری طور پر بعض حکمرانوں کا ایسا تصور پیش کیا گیا ہے جو تاریخی شواہد کی روشنی میں صحیح نہیں۔ مثال کے طور پر شاہجہاں کو ایک ایسے بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہے اپنے خزانے کی بے شمار دولت دربار کی شان و شوکت، علما و شعرا کی قدردانی اور عالیشان عمارتوں کی تعمیر پر صرف کرتا ہے۔ عالیشان عمارتوں کی تعمیر کے لیے رعایا سے ظلم و ستم کر کے روپیہ وصول کرتا ہے۔ شاہجہاں کی ایسی تصویر پیش کرنا تاریخی شواہد کے ساتھ بے انصافی ہے۔ یہ بات بھی تاریخی ہے کہ شاہجہاں دوسرے مغل بادشاہوں کی طرح محنت کوشی کی زندگی بسر کرتے تھے وہ کم سے کم ۱۲ گھنٹے تک کام کرتے تھے۔ تلوار کے دھنی تھے اور لڑائیوں میں خود حصہ لیتے تھے۔ انتظام حکومت کی مصروفیتیں انھیں دم لینے کی فرصت نہ دیتی تھیں۔ ایسی محنت کوش زندگی گذارنے کے بعد بھی وہ علم و فن میں دلچسپی لیتے تھے اور علما اور شاعروں کی قدردانی کرتے تھے۔ فن تعمیر میں وہ ایسی عمارتیں یادگار چھوڑ گئے ہیں جو آج بھی ہندوستانی تہذیب کے عروج کی تاریخ بنی ہوئی ہیں۔ اور یہ یقیناً ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ثبوت ہیں۔ پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ شاہجہاں نے عمارتوں کی تعمیر کے لیے کوئی نیا ٹیکس لگایا تھا یا رعایا پر ظلم و ستم کر کے روپیہ وصول کیا تھا۔ مصنف نے علاء الدین، فیروز شاہ، شیر شاہ، اکبر اور اورنگ زیب جیسے بادشاہوں کے انتظامی کارناموں کو پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ نہیں پیش کیا۔ ان سب بادشاہوں نے اپنے طور پر کسانوں کی فلاح و بہبود کی پوری کوشش کی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں کچھ زیادہ کامیاب ہوئے اور کچھ کم۔ اگر ان بادشاہوں کی زرعی اصلاحات پر کتاب میں پوری توجہ کی جاتی تو ہمارے ملک کے ان بچوں کے ذہن میں ان بادشاہوں کا دوسرا ہی تصور پیدا ہوتا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کتاب کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے مرہٹوں اور خصوصاً شیواجی کے بیان کے لیے زیادہ صفحات دیے گئے ہیں، ساتھ ہی ساتھ مرہٹوں کے انتظام کی بیجا تعریف کی گئی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ شیواجی کی وفات کے بعد مرہٹہ گردی ظلم و ستم کے مترادف قرار پاتی تھی۔

تحریک آزادی کے بعض اہم رہنماؤں کو یکسر یا تقریباً نظر انداز کیا گیا ہے مثلاً طیب جی، مولانا حسرت، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد۔ مولانا آزاد کا ذکر دوسرے رہنماؤں کے ساتھ سرسری کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ بعد میں اس کا باقاعدہ اردو ترجمہ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں محاورہ اور زبان کے استعمال کی غلطیاں ملتی ہیں۔ بعض مقامات پر عبارتیں مربوط بھی نہیں رہ گئی ہیں لیکن مجموعی طور پر زبان صاف، سادہ اور عام فہم ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی ملتی ہیں مثلاً [illegible] کو [illegible] لکھا گیا ہے اور Discovery of India کا ترجمہ تلاش حق۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا، پبلشر [illegible] نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔